سیرت طیبہ پر مستشرقین کی تصانیف

ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی

ذہنی طور پر مفتوح اور مغلوب قومیں یا تو فاتح اقوام کی نقالی کرنا اپنے لئے باعث فخر و سعادت سمجھنے لگتی ہیں یا پھر ان سے دلی نفرت کرنا اور اسے پروری روا رکھنا اپنا مقدس فریضہ سمجھ بیٹھتی ہیں۔ نفرت اور بغض و عناد سے عبارت اسی انداز فکر کو مستشرقین اپنی زبان میں Xenophobia کہتے ہیں۔ اسلام اور سیرۃ طیبہ سے متعلق اہل مغرب کا رویہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اسی نفرت و عداوت کا آئینہ دار ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں پسپا ہونے پر ان میں اسلام کے خلاف پیدا ہوئی تھی۔

احساس برتری کے زعم میں مست اور خود پسندی کے نشے میں غرق کلیسا مشرق کے افق پر پھٹتی ہوئی پو کو نہ دیکھ سکا۔ وہ خواب غفلت سے اس وقت بیدار ہوا جب آفتاب اسلام مشرق کو منور کرنے کے بعد انتہائی برق رفتاری کے ساتھ مغرب پر بھی ضیا پاشی کرنے لگا۔ اس آفتاب میں روشنی ایسی خیرہ کر دینے والی تھی کہ کلیسا اس کو برداشت نہ کر سکا اسے اپنے بچاؤ کی صرف یہی صورت سوجھی کہ اس آفتاب پر پردہ ڈالا جائے اور اہل مغرب یہ فریضہ پورے تاریخی تسلسل اور تواتر کے ساتھ آج بھی پوری طرح انجام دے رہے ہیں گو دعویٰ اس کا ہے کہ اب نہ قرون وسطیٰ کے تعصبات ہیں نہ وکٹورین عہد کے تسامحات بلکہ طرز فکر

علمی، سنجیدہ اور سائنسی ہو گیا ہے۔

مغربی اہلِ قلم کی ایک پوری جماعت نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس بات کے لئے وقف کر دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پیغمبر اسلام، عقائدِ اسلام اور احکاماتِ اسلام، عقائدِ اسلام غرضیکہ اسلام سے متعلق ہر شے کے خلاف پروپیگنڈا کیا جائے اور ان کو ایسا مسخ کر کے پیش کیا جائے کہ اسلام سے ناواقف کسی شخص کا دل اسلام کے مطالعے کی طرف مائل ہی نہ ہو۔ سچ کو اس طرح بار بار اور پر زور طریقے سے جھوٹ کہا جائے کہ رفتہ رفتہ دماغ اسے جھوٹ ہی سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان مصنفین کی ساری دلچسپی اس بات میں تھی کہ اسلام کو کس طرح مسخ کر کے پیش کیا جائے خواہ اس کے لئے تاریخ کا گلا گھونٹنا پڑے یا نت نئے افسانے تراشنے پڑیں۔

اسلام کی تصویر کو مسخ کرنے کے لئے مستشرقین کی نظرِ انتخاب سب سے پہلے سیرۃ طیبہ پر پڑی۔ ایسا کرنے میں کئی مصلحتیں تھیں۔ اسلام کا بنیادی مأخذ تو قرآن پاک ہے لیکن اوّل تو عربی سے ناواقفیت آڑے آئی۔ دوسرے قرآن پاک سے متعلق بحث ہوتی بھی تو سراسر علمی جس سے عام مغربی قارئین کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ طے یہی پایا کہ سیرۃ طیبہ میں جا بجا عامیانہ افسانوں کی آمیزش کی جائے اور اسے اس درجے سنسنی خیز بنا دیا جائے کہ اس سے عوام الناس کو بھی دلچسپی پیدا ہو جائے اور ان کی اسلام دشمنی راسخ ہو جائے۔

سیرۃ طیبہ سے غیر معمولی دلچسپی اور اس باب میں قرونِ وسطیٰ کے اہلِ قلم کی تصانیف کی بہتات میں دخل ایک حد تک مغرب کی شخصیت پرست فطرت کو بھی ہے۔ یہی طبعی رجحان مغرب کے ان عقائد میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ حضرت عیسیٰ کو اس نے ابن اللہ ٹھہرایا اور عیسائیت کو محض حضرت عیسیٰ کی سوانح کا پرتو قرار دیا۔ مستشرقین چاہے بیسویں صدی

کے سند یافتہ علما رہوں یا قرون وسطی کے نیم خواندہ لوگ ہوں وہ آج تک یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ سیرۃ کے بغیر مذہب اسلام کا مطالعہ ناممکن ہے۔ اسی نکتے کو بیسویں صدی ہی کے ایک مستشرق نے بڑے پرزور الفاظ میں اس طرح ادا کیا ہے۔

"No understanding of the minds and Characters of Mohammedans is possible without some knowledge of that which has made them what they are"

"اس چیز کے کچھ علم کے بغیر جس نے محمدیوں (مسلمانوں) کو وہ کچھ بنا دیا جو وہ ہیں مسلمانوں کے ذہن اور کردار کو سمجھنا ممکن نہیں"۔

فی نفسہٖ تو یہ تصور بالکل صحیح ہے کہ سیرۃ طیبہ کے بھرپور مطالعہ ہی کی مدد سے مذہب اسلام کا ادراک ممکن ہے لیکن مستشرقین سیرۃ طیبہ پر طرح طرح کے اعتراضات کر کے قارئین کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ اسلام کی عملی صورت ہے تاکہ لوگ اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ اسلام کے خلاف معاندانہ لٹریچر اور تعلیمات سیرت کو مسخ کرنے کے مشن کا آغاز سینٹ جان (SAINT JOHN) (۶۷۰ء۔ ۷۴۹ء) کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ گو موصوف دمشق ہی کے باشندے تھے لیکن ان کی تصانیف de haersibus اور Dialexis سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے مبادیات تک سے ناواقف ہیں۔ ان کی تصانیف تنفر اور بغض وعناد سے عبارت ہیں۔ یہی انداز بیسویں صدی تک کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ سینٹ جان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے متعلق ہر ممکن غلط بیانی کو عین تاریخی واقعے کی شکل میں پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیا مثلاً آنحضرت سے بحیرہ راہب کی ملاقات کے

واقعے میں ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ قاری کو گمان ہوتا ہے کہ اسلام دراصل عیسائیت ہی کی ایک مسخ شدہ شکل ہے۔ سینٹ جان کا تراشا ہوا یہ افسانہ آج کے مغرب کے مسلمات میں سے ہے۔

شاہ باسل اول (Emperor Basil I) کے حکم پر بازنطینی اہل قلم نسطاس (Nicetas) نے نویں صدی عیسوی میں ردِّ اسلام میں ایک کتاب بعنوان (Refutatio Mohammedis) تصنیف کی۔ اس تصنیف کو تاریخ سے ذرا بھی علاقہ نہیں ہے۔ کتاب کے مندرجات کیا ہیں محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں (نعوذ باللہ) گستاخانہ کلمات اور شر انگیز اتہامات ہیں۔ اسی طرزِ فکر کی نمائندہ اس دور کی دوسری اور تصانیف مثلاً تھیوفینس (Theophanes) کی Chroni les سینٹ یولوجیس قرطبی کی Liber Apologeticus Maritwur اور سان پیڈرو باسکال کی Sobre el Seton Mahometana ہیں ان تصانیف کا پھیلایا ہوا زہر رفتہ رفتہ مغرب کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔

ادب سماج ہی کا آئینہ ہوتا ہے۔ کوئی ادیب پیدائشی طور پر خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، اپنے دور کے مسلمات سے کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کا ادب چاہے وہ لاطینی زبان میں والٹیر کا کلام ہو یا فرانسیسی میں ایسگزنڈر کا یا ایمبریکو (Embrico) کی نظم A Vita Mahumeti ہو۔ اپنے زمانے کے تعصبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں مثال شہرۂ آفاق اطالوی شاعر دانتے (Dante) (۱۲۶۵ء - ۱۳۲۱ء) کی ہے۔ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے اوتار کی حیثیت سے دانتے کو مغرب میں آج

تک پوجا جاتا ہے اور اس کی علم دوستی فراخ دلی اور روشن دماغی کا چہار سو شہرہ ہے لیکن اس کی مشہور نظم Divine Comedy کے بعض حصے ناقابل بیان حد تک شرمناک اور جہالت و تعصب کی بدترین مثال ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کی ان تصانیف کے اس سرسری جائزہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان مصنفین کے پیش نظر بس یہی ایک مقصد تھا کہ کس طرح اس عظیم ہستی اور اس کے مقدس مشن کو داغدار کیا جائے تاکہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے درحقیقت کلیسا کے لئے یہی ایک راہ باقی تھی کیونکہ دلائل سے اسلام کے پیغام کو غلط ثابت کرنے کی تو اس میں سکت ہی نہیں تھی۔

جہاں تک ان مصنفین کے اعتراضات کا تعلق ہے ان میں سے ایک بھی وقیع علمی یا سنجیدہ انداز کا نہیں۔ کسی مصنف کو وحی اور نبوت ہی سرے سے غیر حقیقی محسوس ہوئی تو کسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی اور مدنی ادوار کی زندگی میں تناقض نظر آیا۔ کسی نے آنحضرتؐ کے اخلاقی پہلو پر اعتراضات کئے تو کسی کو آنحضرتؐ کی کامیابی میں جادو کا ہاتھ کارفرما نظر آیا۔ ان مصنفین کو اسلام میں اول تو کوئی خوبی ہی نظر نہیں آئی اور اگر کسی بات کی تعریف بھی کی تو اس کے بارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ یہ بحیرہ راہب کی تعلیمات کی وجہ سے ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی ان تصانیف کو بجا طور پر مجموعۂ خرافات کا نام دیا جا سکتا ہے

قرونِ وسطیٰ تو خیر بقول اہل مغرب کے ان کی تاریخ و تمدن کا ایک تاریک دور (Dark Ages) ہے لیکن سیرت طیبہ سے متعلق ذہنوں پر چھائی ہوئی تاریکی کو نہ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی عملیت دور کر سکی نہ دورِ عقلیت (Ageof Reason) کی عقلیت۔ دوسرے علوم و فنون میں یورپ نے واقعتاً عقل کی رہنمائی میں نئے نئے تجربات کئے

اشیار کو جانچا پرکھا، سائنسی مزاج اپنایا اور تہذیب و تمدن کے سرمائے میں بہت کچھ اضافہ کیا لیکن تاریخِ اسلام اور آنحضرتؐ سے متعلق رویہ بدستور تنفر، تنگ نظری اور جہالت ہی کا رہا۔

سیرتؐ کے ضمن میں ذکر دانتے کی تمام تہاد علم دوستی اور روشن خیالی کا ہو چکا، اس سے بھی کہیں بڑھ کر جہالت کی کھلی ہوئی مثال شیکسپیر (۱۵۶۴ء - ۱۶۱۶ء) کے ہاں نظر آتی ہے۔ وہی شیکسپیر جس کا نام آتے ہی اہلِ علم و فن گویا سربسجود ہو جاتے ہیں۔ شیکسپیر بلاشبہ عظیم فنکار ہوا ہے اور یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ فطرتِ انسانی کی نباضی اور ادراک اس سے بڑھ کر کسی اور فنکار کے ہاں نہیں ملتا مگر دوسری طرف مذہب کے بارے میں شیکسپیر کی کم علمی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ اپنے ایک تاریخی ڈرامے ہنری ششم (Henry VI) (ایکٹ اوّل منظر دوم لائن نمبر ۱۴۰) میں وحی کے بارے میں لکھتا ہے کہ ایک فاختہ نزولِ وحی کا فریضہ انجام دیتی تھی۔

مشہور انگریزی انشا پرداز لارڈ بیکن (Bacon) (۱۵۶۱ء - ۱۶۲۶ء) نے اس سے بھی کہیں بڑھ کر افسانہ طرازی کی ہے۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ اور تاریخی واقعے کے طور پر اپنے ایک انشائیے "Of Boldness" میں طنزیہ اور استہزائیہ پیرایہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ آنحضرتؐ کو اس بات کا دعویٰ تھا کہ پہاڑ بھی ان کے مطیع ہیں اور ایک مجمع کی موجودگی میں اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ایک پہاڑی کو حرکت کرنے کا حکم دیا لیکن جب پہاڑی میں جنبش پیدا نہ ہوئی تو یہ جملہ کہا:

"If the hill will not come to Mahomet,
Mahomet will go to the hill."

"اگر پہاڑ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس نہیں آئے گا تو محمدؐ خود اس کے پاس جائیں گے"۔ اور یہ فقرہ آج تک انگریزی زبان میں بطور ضرب المثل رائج ہے۔

بیکن اور شکسپیر کے مندرجہ بالا اقتباسات سے مقصود محض ان کی جہالت کو آشکارا کرنا نہیں بلکہ اس امر کی نشاندہی کرنا ہے کہ تعصبات جب ذہنوں میں راسخ ہوجاتے ہیں تو ان سے سماج کا کوئی طبقہ محفوظ نہیں رہتا اور یہی تعصبات رفتہ رفتہ عقائد کی شکل اختیار کرجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس دور کی ساری تصانیف میں اسلام دشمنی اور واقعات سیرت کو حد درجہ مسخ کرکے پیش کرنے کی خصوصیات مشترک ہیں۔

اہل مغرب کی اسلام دشمنی کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اوائل سترھویں صدی میں اصلاح (Reformation) تحریک کے زیر اثر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی باہمی مناظرہ بازی میں ایک فریق دوسرے کو مطعون کرنے اور مردود ٹھہرانے کے لئے جو انتہائی سخت الزام لگاتا تھا وہ یہ ہوتا تھا کہ فریق مخالف اسلام سے متاثر ہے۔ گویا اسلام سے کسی طرح واقفیت یا تعلق عوام کے دلوں میں کراہیت اور تنفر پیدا کرنے کا موثر ترین حربہ تھا۔

سیرت طیبہ سے متعلق قرون وسطیٰ کے اہل قلم کی پھیلائی ہوئی جہالت کی ایک تاویل یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ ان مصنفین کو اسلام سے براہ راست واقفیت نہ تھی لیکن اٹھارویں صدی کے ان مصنفین کے لئے تو اسلام اور سیرت سے متعلق براہ راست مواد حاصل کرنے کے کہیں بہتر وسائل موجود تھے کیونکہ تقریباً تمام مغربی ممالک مثلاً ہالینڈ، انگلستان اور فرانس سے مسلم ممالک کے تجارتی تعلقات تھے اور خود مغربی اہل قلم میں عربی سے واقفیت اس حد تک پیدا ہوچلی تھی کہ ۱۶۴۹ء میں قرآن پاک کے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں تراجم شائع ہوئے۔ لیکن جب شر انگیزی ہی مقصود ہو تو آنکھوں پر پردے پڑجاتے ہیں، کان

بہرے ہو جاتے ہیں اور دماغ کھلی ہوئی حقیقتوں کو بھی ناقابل التفات ٹھہرانے لگتا ہے۔

سیرت طیبہ پر سترھویں صدی کی ایک اہم تصنیف ہمفری پریڈکس (Humphery Prideaux) کی The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mahomet ہے۔ مندرجات کا اندازہ عنوان ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ۱۶۹۸ء تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے اور مقبول عام بنے۔ اس تصنیف کو مدتوں تک اہل مغرب کے لئے سیرت پر سند کا درجہ حاصل رہا جارج سیل (SALE) کی عربی دانی بے شک اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ان کے ترجمۂ قرآن (۱۷۳۴ء) کے حواشی بھی اپنے دور کے تعصبات ہی کے آئینہ دار ہیں ایسے ہی تعصبات کا بڑا نمایاں عکس اس دور کے دوسرے اہم فرانسیسی مترجم قرآن (SAVARY) کے ترجمۂ قرآن (۱۷۵۲ء) کے ان حصوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں آنحضرتؐ کا ذکر مبارک آیا ہے۔ نامور مؤرخ ایڈورڈ گبن (Gibbon) بھی ان تعصبات سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف The Decline and the Fall of the Roman Empire مغربی معیارات تاریخ نویسی کے اعتبار سے یقیناً بلند پایہ ہے لیکن آنحضرتؐ سے متعلق اس کے نتائج اپنے دور کے تعصبات کی پیداوار ہیں۔

اسلام دشمنی اور واقعات کو مسخ کرنے کی بدترین اور گھناؤنی مثال فرانسیسی اہل قلم والتائر VOLTAIRE کے ہاں ملتی ہے۔ سیرت پر اس کا ڈرامہ Le Fanatisme Or Mahomet le Prophete (۱۷۴۲ء) اس دور کے تعصبات اور خرافات کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کے مندرجات ایسے پست سطحی اور رکیک ہیں کہ ان کا ذکر تک کرنا مشکل ہے۔ صدیوں پر محیط اس پورے دور میں ایک حد

تک سلجھے ہوئے انداز کی مثال صرف جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) کی نظم "Mahomets Gesang" (۱۷۷۳ء) میں پائی جاتی ہے لیکن تعصبات سے بالکل بری یہ نظم بھی نہیں۔

قصہ مختصر اٹھارویں صدی کے آخر تک ایک پورا دفتر اس مضمون کا تیار ہو گیا کہ (معاذاللہ) اسلام لغویات سے پر اور خوبیوں سے قطعاً عاری ایک مذہب کا نام ہے اور سیرت طیبہ سے متعلق بھی یہ تصورات اہل مغرب کے ذہنوں میں خوب رچ بس گئے کہ نبوت کا دعویٰ باطل تھا اور وحی کی نہ کوئی اصلیت ہے نہ جواز اور یہ ذات گرامیؐ کسی اعتبار سے بھی قابل ذکر یا قابل تقلید نہیں۔ اسی طرح یہ عقیدہ بھی اہل مغرب کے شعور میں خوب راسخ ہو گیا کہ اسلام کو جو کچھ بھی کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں وہ محض بزور شمشیر ورنہ کیا اخلاقی کیا روحانی ہر اعتبار سے یہ مذہب قابل نفرت ہے۔ غرضیکہ ظہور اسلام کے گیارہ سو سال بعد بھی رویّہ بدستور معاندانہ رہا اور یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تصانیف قرونِ وسطیٰ کے تعصبات کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہیں۔

وکٹورین اور جدید دور کی تصانیف

انیسویں صدی کے مغرب کی زندگی میں صنعتی انقلاب اور جمہوریت وغیرہ کی تحریکوں کے زیر اثر ہر ہر میدان میں انقلاب آئے لیکن اسلام اور سیرت طیبہ سے متعلق طرز فکر بنیادی طور پر وہی رہا جو قرونِ وسطیٰ میں تھا۔ اتنا فرق ضرور ہوا کہ واقعات کو مسخ کرنے کے انداز میں ایک نوع کا سلیقہ آ گیا۔ جو بات پہلے براہ راست اور دوٹوک الفاظ میں کہی جاتی تھی وہ اب مبہم انداز میں کہی جانے لگی۔ لیکن رویہ رہا بدستور تعصبات اور

بغض وعناد ہی کا۔

اس دور کی تصانیف کا نکتۂ آغاز مشہور مغربی اہل قلم ٹامس کارلائل (Thomas Carlyle) (۱۷۹۵ء - ۱۸۸۱ء) کے لکچرز کو سمجھ لیجئے تاریخ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کارلائل نے آنحضرتؐ کا شمار تو یقیناً تاریخ کے اہم ترین افراد میں کیا لیکن اس عظمت کو تسلیم کرنے میں بڑے قیل وقال سے کام لیا۔ اس کے لکچرز میں جا بجا ایسی باتیں ملتی ہیں جو قرونِ وسطیٰ کے تعصبات پر مبنی ہیں۔

سیرت طیبہ سے متعلق ایک قابل ذکر کام اس دور میں یہ ہوا کہ ابتدائی سیرت نگاروں مثلاً ابن ہشام واقدی اور ابن سعد کے تراجم مغرب میں شائع ہوئے۔ مترجمین میں نمایاں شخصیتیں جرمن مستشرقین فان کریمر (Van Kremer) اور اسپرنگر (Sprenger) کی ہیں۔ سیرت پر اس دور کی اہم تصانیف ویل (Weil) کی (۱۸۴۳ء Mohammed der Prophet, Sein Leben und Sein LehreEssai su'l histoire der Arabes اور پرسی ویل کی (۱۸۴۷ء) ہیں۔ میور (Muir) اور دوسرے متعدد مستشرقین کے لئے یہ دونوں تصانیف مدتوں تک سرچشمۂ ہدایت بنی رہیں جبکہ ان مصنفین کی علمیت کا عالم یہ ہے کہ ان کو اسلام بہ طور ایک مذہب اور تاریخی حقیقت کے سرے سے تسلیم ہی نہیں۔ دراصل دونوں نے اسلام کو عیسائیت اور یہودیت کی ایک مسخ شدہ شکل قرار دیا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں اسپرنگر نے سیرت طیبہ سے متعلق ایک نئے طرز فکر کی طرح ڈالی۔ چونکہ موصوف علم طب میں سند یافتہ تھے لہٰذا انہوں نے نزول وحی کی کیفیت کو صرع یعنی مرگی کے مرض سے تعبیر کیا

اس موضوع پر ان کی تصنیف Das Leben und die Lehredes Mohammed (۱۸۶۱ء - ۱۸۶۵ء)

ایک عرصے تک مرجع عوام و خواص رہی۔ ایک نہیں متعدد اہل قلم نے اسپرنگر کے اس مفروضے کو عین حقیقت تسلیم کر کے نبوت اور سیرت پر خوب حاشیہ آرائی کی۔ اس طرزِ فکر کی نمائندہ کتابوں میں ڈاکٹر فرانز بہل (Dr. Foranz Buhl) کی Muhammad's Liv (۱۹۰۳ء) آرلینڈ کی On the Hallucination of Mohammed (۱۸۸۶ء) اور ڈاکٹر میکڈانلڈ (Dr Macdonald) کی Aspects of Islam (۱۹۱۱ء) شامل ہیں۔

سر ولیم میور (Sir William Muir) نے ایک دوسرا ہی فتنہ کھڑا کیا۔ ان کی تصنیف A Life of Mahomet (۱۸۶۱ء) کا مرکزی خیال یہ ہے کہ نعوذ باللہ اسلام اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ تہذیب و تمدن اور آزادی کا مخالف اور کوئی نہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے تعصبات سے پُر اس تصنیف کو اہل مغرب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خود مصنف کی زندگی ہی میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اپنے مندرجات سے کہیں بڑھ کر یہ تصنیف اس اعتبار سے فتنہ سامانی کا باعث بنی کہ میور کی اس تصنیف سے متاثر ہو کر مغرب میں درجنوں کتابیں شائع ہوئیں اور آج تک ہو رہی ہیں۔

چونکہ سیرت طیبہ کے بنیادی مآخذ قرآن پاک اور احادیث ہیں لہٰذا مستشرقین کے ایک جتھے نے ان بنیادی مآخذوں کو ہی مشکوک ٹھہرا دیا تاکہ سیرت کی تاریخیت اور اس کا پیغام دونوں ہی بے معنی ہو کر رہ جائیں اپنے اس مشن کے تکمیل کے لئے انہوں نے لبادہ تو محققین کا اوڑھا

لیکن شعوری اور لاشعوری طور پر ان کی فکر بھی قرونِ وسطیٰ کے اولین اہلِ قلم سے مختلف نہیں افسانوں کو تاریخی رنگ میں پیش کرنا دونوں کی مشترک خصوصیت ہے۔ مستشرقین کی اس صف میں گولڈزیہر (Goldziher) اور ہنری لیمنس (Henry Lammens) نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگر گولڈزیہر کے نزدیک بیشتر احادیث ضعیف اور تاریخی اعتبار سے ناقابلِ اعتبار ہیں تو لیمنس کے نزدیک آنحضرتؐ کی شخصیت اور واقعات کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں مغرب میں سیرت سے متعلق ایک اور خیال خوب مقبول ہوا۔ اس طبقہ خیال کے مصنفین کو تاریخی اعتبار سے اسلام اور آنحضرتؐ کی کامیابی تسلیم ہے لیکن کامیابی انہیں اسلام کے ہمہ گیر انقلابی پیغام اور آنحضرتؐ کی مثالی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ ظہورِ اسلام کے زمانے کے مخصوص سماجی اور معاشی عوامل کے سبب نظر آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مصنفین کی نگاہ میں آنحضرتؐ کا مقام بس ایک ایسے ذہین سیاسی رہنما کا ہے جس نے اپنی سیاسی بصیرت سے اپنے سماج کے کمزور اور غریب طبقوں کی آرزوؤں اور مفادات کو مدِنظر رکھ کر ایک نیا پیغام پیش کیا جس نے مروجہ سیاسی اور معاشی نظام کو تہہ و بالا کر ڈالا اور اس طرح آنحضرتؐ نے خود اقتدار کامل بھی حاصل کر لیا۔ گویا اسلام محض معاشی بنیادوں پر قائم کیا ہوا ایک نظام ہے اور آنحضرتؐ اس کے پرجوش اور کامیاب بانی۔ اس طرزِ فکر کی ابتدا۔ جرمن مستشرق ہبرٹ گرم (Hubert Grimm) کی تصنیف Mohammed (۱۸۹۲ء) سے ہوئی اور اسی اندازِ فکر کا نقطۂ عروج ڈیوڈ مارگولیتھ (David Margobuith) کی متعدد تصانیف ہیں مثلاً موصوف کی Mohammed and the Rise of Islam (۱۹۰۵ء) نیز

Encyclopedia of Religion and Ethics (ایڈنبرا ۱۹۵۲ء) اور Encyclopedia Britannica (کیمبرج ۱۹۱۰ء) میں شائع شدہ ان کے مضامین جو آج تک اہل مغرب کے ذہنوں پر اپنے مسموم اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ کم و بیش یہی نقطۂ نظر اطالوی مستشرق لیون کیٹانی (LEON CAETANI) کی تصنیف Annali dell' Islam (۱۹۰۷ء) میں بھی نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے مشہور مورخ ٹوئن بی Arnold Toyonbee کی گو سیرت طیبہ پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے لیکن ان کی A Study of History (۱۹۶۱ء) میں جہاں کہیں بھی آنحضرتؐ کا ذکر آیا ہے وہاں تعصب پوری طرح نمایاں ہے۔ ٹوئن بی کو تضاد اور تناقض آنحضرتؐ کی مکی اور مدنی زندگی کے ادوار میں نظر آیا ہے۔ اور یہ نکتہ اعتراض ایک ٹوئن بی ہی پر کیا موقوف کم و بیش ہر مستشرق کی تصنیف میں موجود ہے۔ دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے اور یہ عقیدہ رکھنے والی قوم پر کہ: "جو کچھ قیصر کا ہو وہ اسے دے دو اور جو کچھ خدا کا ہے خدا کے حوالے کر دو"۔ یہ حقیقت کسی طرح واضح نہیں ہوتی کہ کسی مذہبی نظام میں دین و دنیا کی وحدت بھی ممکن بلکہ ضروری ہے۔

سیرت طیبہ پر مخصوص رجحانات کی آئینہ دار بیسویں صدی کی تصانیف کا ذکر ہو چکا۔ ان متفرق تصانیف تو ان میں بھی تعصبات کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ ان تصانیف کا صرف مرکزی نکتۂ خیال پیش ہے۔

غرضیکہ تصانیف خواہ قرونِ وسطیٰ کی ہوں یا جدید ہوں سیرت طیبہ کے واقعات کو غلط انداز میں پیش کرتی ہیں۔ مستشرقین کی تصنیفات سے مسلم محققین کی واقفیت

بہت ضروری ہے تاکہ وہ ان کا رد کرکے اور اسلامی تعلیمات کو صحیح انداز میں پیش کرکے لوگوں کو مستشرقین کے شر انگیز اثرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ چونکہ خود مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے طبقے کا اسلام سے واقفیت کا دارومدار ان ہی تصانیف پر ہے اس لئے یہ اقدام کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

حوالہ

1 G.W. Broomfield, "The Psychology of Mohammed
The Muslim World, XVI, (1926), p. 37

★★★